ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

محمد نوید اقبال ۞

اردو سوانح پر پاکستانی کلچر کے اثرات کا جائزہ

Analytical Studies of Urdu Biography on the Effect of Pakistani Culture

By *Muhammad Naveed Iqbal, Research Scholar, Department of Urdu, Karachi University, Karachi.*

ABSTRACT

The basic purpose of this research study was to find out the effects of Pakistani culture on biography, and it is concluded from the biographical books that when biographer writes about a person, then he/she writes about the person's life, habits, religion, dress, weather conditions, and reginal music etc. and all these are the basic components of a culture. Alloy Pakistani culture is like a bunch of flowers which represents the cultures of different areas/provinces of Pakistan. After reading a biography the reader not only becomes aware about the circumstances of past, but culture is also transferred from one generation to the other. As when a reader gets impressed by the culture of the ancestors, then also tries to adopt their ways of living. As a biography sheds political, social, economic and moral impact on the readers. Therefore, it is recommended that selected biographies of renown personalities should be made part of curriculum and future researchers are asked to conduct a comparative research on the culture depicted in the biographies and culture of present era, which will elaborate the culture difference for the present and future modern generation so to bring them back to the culture of their forefathers.

Keywords: Pakistani Culture, Biography, Curriculum

کلچر انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز یا ذات کی جسمانی اور ذہنی نشوونما اور اصلاح وغیرہ۔ عام

۞ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی، کراچی۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اصطلاح میں اس سے مراد انسان کی ذاتی اور اجتماعی نشوونما کے جملہ پہلو ہوتے ہیں۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے تہذیب اور ثقافت کے الگ مفاہیم کو یک جا کر کے ایک لفظ کلچر استعمال کیا ہے۔اس کے معنی بقول ڈاکٹر جمیل جالبی یہ ہوئے کہ:

> کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا جسمانی، خارجی ہوں یا داخلی؛ احاطہ کر لیتا ہے۔(۱)

ثقافت کا مفہوم ذہنی اور فکری صلاحیتوں پر محیط ہے۔ثقافت سے مراد کسی معاشرے کے افراد کا طرز زندگی اور تمدن کا حسن ہوتا ہے۔اس میں وہ تمام امور شامل ہوتے ہیں جن سے اس معاشرے کے جمالیاتی ذوق، تفریحی شوق اور فنی مہارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔(۲) لفظ تہذیب انداز واطوار کی شائستگی اور پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے۔اس طرح دونوں لفظ مل کر ایک ایسے انسان کا تصور پیش کرتے ہی جو آداب و معاشرت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون میں بھی زیرکم و دانا ہو۔ جب اس مفہوم کو فرد سے ہٹ کر پورے معاشرے کے لیے استعمال کریں گے تو اس سے ایسا معاشرہ مراد ہوگا جو اطوار و انداز کے ساتھ ساتھ علوم وفنون میں ترقی و مہارت رکھتا ہو۔

کلچر ایک کُل ہوتا ہے جس میں اس کے بسنے والوں کے عقائد علوم، طرز معاشرت، عام معاملات زندگی، فنون و ہنر، قوانین غرض تمام ارادی اور غیر ارادی افعال کسی نہ کسی طور پر شامل ہوتے ہیں۔کسی قوم کی شناخت اس کا کلچر ہوتا ہے۔ یہ اس قوم کی قدر مشترک ہے جس سے نہ صرف اس کی پہچان ہوتی ہے بلکہ دوسرے معاشروں سے ممیز حیثیت کی شناخت بھی ہوتی ہے۔قومی کلچر کی شناخت میں پہلی اکائی فرد ہوتا ہے۔کلچر اس کی زندگی کا مقصد، اصول اور اقدار معین کرنے میں مدد کرتا ہے۔ یہی رویہ ایک قومی سوچ اور اجتماعی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ چھوٹے بڑے علاقائی کلچر اور معاشرتی اکائیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک وسیع تر رشتے میں نمودار ہو کر قومی سطح پر اٹھ جاتی ہیں۔(۳)

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مختلف ادبا و شعرا نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو سوانح کی صورت میں قلم بند کیا ہے، جن کے مطالعے سے نہ صرف ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں، بلکہ اس دور کی تاریخ، تہذیب و تمدن، معاشرت، عادات و اطوار اور سیاسی حالات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نیز جن شخصیات کی سوانح بعد میں لکھی گئیں تو اُن کے سوانح نگاروں نے صاحبِ سوانح کو معاشرتی و سماجی تناظر سے جوڑ کر دیکھنے کا اہتمام کیا ہے۔

ایک سوانح نگار اپنے یا کسی شخص کے بارے میں کچھ تحریر کرتا ہے، تو وہ شخصی زندگی، عادات واطوار، مذہب، اندازِ رہن سہن، موسم، لباس، رسم ورواج، علاقائی موسیقی، کھیل کود، ذریعہ معاش، ثقافت و سیاست، باہمی ربط وضبط اور لین دین کو موضوع بحث بناتا ہے اور یہ سب کلچر کے بنیادی اجزا ہیں۔مخلوط پاکستانی کلچر پھولوں کا ایک حسین گل دستہ ہے جس میں تمام صوبوں کا رنگ جھلکتا ہے۔جس کو پاکستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے سوانح نگاروں نے واضح طور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

پر بیان کیا ہے۔ ایک سوانح نہ صرف اپنے عہد کے حالات و واقعات کی تصویر پیش کرتی ہے، بلکہ روایات کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرنے اور زندگی کو درست سمت میں ڈالنے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ کسی انسان کی سوانح عمری تنہا اس کی سوانح عمری نہیں ہوتی بلکہ اس کے ماحول اور اُس سے وابستہ پہلوؤں کا مطالعہ ہوتی ہے۔ سوانح کے مطالعہ سے قاری کی ذہنی وفکری نشوونما ہوتی ہے۔ کسی قوم کے زندہ یا قائم رہنے کے لیے اس کے کلچر کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔ سوانح یا خودنوشت سیاسی، سماجی، معاشی اخلاقی اور تہذیبی اثرات بھی مرتب کرتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک اچھی سوانح آنے والی نسلوں کو کلچر سے آگاہی اور ان کی اخلاقی اور سماجی تربیت کا کام انجام دے سکتی ہے۔

اردو ادب میں سوانحی ادب کی روایت کا جب ذکر ہوتا ہے تو ذہن حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب اور اُن جیسی دوسری سوانح کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ تقسیم تک آتے آتے کئی عمدہ سوانح سامنے آجاتی ہیں جو مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ سوانحی ادب میں اہم اضافہ سمجھی گئیں۔ آزادی کے بعد منظرِ عام پر آنے والی سوانح کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک مختلف اور بدلے ہوئے عہد میں جی رہے ہیں۔ سوانح نگاروں نے محض گزری ہوئی زندگی کو بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اپنی زندگی کے حوالے سے زمانے کی شناخت کا عنصر بھی اس میں سمو دیا ہے۔ سوانحی ادب میں جہاں زبان و بیان میں نکھار آیا، وہیں واقعات اور ماحول کو سوانح میں اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں سوانح نگاری کی روایت مستحکم ہوگئی ہے۔ چیدہ چیدہ سوانح کا اس حوالے سے مطالعہ نہایت دل چسپی کا حامل ہے۔

عبدالمجید سالک کی خودنوشت ''سرگزشت'' میں مصنف نے اپنے حالات کے ساتھ اس ماحول کا نقشہ خوب صورتی سے کھینچا ہے جس میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ یہ محض آپ بیتی ہی نہیں، بلکہ پنجاب کے سیاسی، سماجی، علمی و ادبی کلچر کی دل چسپ داستان بھی ہے۔ ان کا اندازِ بیان بھی عام فہم، شگفتہ اور دل چسپ ہے۔ سالک کئی سیاسی پارٹیوں سے وابستہ رہے تھے۔ سیاسی سرگرمیوں کے سبب انھیں ایک سال جیل میں اسیر ہونا پڑا۔ ایامِ اسیری کا واقعہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی، جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے، صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے، سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے، مولانا احمد سعید شیخِ مجلس بن کر بیٹھتے اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل، صوم و صلوٰۃ، تلاوتِ قرآن، تعلیم و تعلم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔ لیکن بعض اوقات قوالی میں اتنا غلغلہ اور ولولہ ہوتا کہ دوسرے دن ہمارے ہمسائے یعنی پھانسی کی کوٹھریوں والے قیدی سپرنٹنڈنٹ جیل سے شکایت کرتے کہ حضور ہمیں یہاں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سے کہیں اور بھیج دیجیے، یہ مولبی لوگ ہمیں ساری رات سونے نہیں دیتے۔(۴)

مشرق کی بہ نسبت مغرب میں بہت سی ایسی سماجی و معاشرتی برائیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جسے مشرقی سماج میں فحاشی سمجھا جاتا ہے۔ مغربی ادب میں جنسی پہلوؤں کو بے باکانہ انداز میں بیان کرنا معمولی بات ہے، جب کہ مشرق میں جب کوئی تخلیق کار جنسی پہلوؤں کو قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے تو اسے شدید ردِعمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود مشرقی سوانحی ادب پر بھی جنسی رجحانات کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جنسی رجحان کو جوش کی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' اور ناول کی تکنیک میں لکھی گئی خودنوشتوں مثلاً ممتاز مفتی کی ''علی پور کا ایلی''، احمد بشیر کی ''دل بھٹکے گا'' میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''یادوں کی برات'' میں جوش کی شخصیت اپنے تمام محاسن و معائب، فکر و فلسفہ، مے نوشی، عشق بازی کے تذکرے، تنگ دستی اور عیش کوشی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ایک بڑی شخصیت نے اس خودنوشت کے ذریعے اپنی کمزوریوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ جب کہ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ مشرقی معاشرے میں جوش کے اس اندازِ زندگی کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوسکا۔

''مٹی کا دیا'' ایک ایسی سوانح ہے جس میں سوانح عمری کے اوصاف ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی وہ تصاویر بھی نظر آتی ہیں جو حقیقی رنگ سے بھرپور ہیں۔ جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کے برعکس میرزا ادیب نے اپنے نقشِ ذات کو خودنوشت میں حاوی نہیں رکھا، نہ ہی تاریخ اور جغرافیہ کے حوالے شامل کیے ہیں، بلکہ انھوں نے زندگی کے بیتے ہوئے واقعات کو ایسی صورت میں پیش کیا جس میں زمان و مکان کے اثرات اور رنگ سما گئے ہیں۔ اس سوانح میں انسانی زندگی کے خدوخال ابھرتے نظر آتے ہیں۔ شہرِ لاہور اپنے نقش و نگار سمیت اس میں دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر کے عام لوگ، اس کی بلند قامت شخصیتیں، اس کی سیاسی زندگی، اس کی انجمنوں کی سرگرمیاں، اس کے باسیوں کے مشاغل اور دل چسپیاں؛ الغرض اس کا ہر پہلو دل کش معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان اس لیے بھی حقیقی اور روشن ہوگیا ہے کہ خود میرزا ادیب کا نقطۂ نظر ہے کہ ''مصنف وہ ہے جو اپنی دھرتی کے نیچے اتر جائے اور وہاں سے ایک درخت کی صورت میں باہر آئے۔'' جیلانی کامران نے ''مٹی کا دیا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے:

> اپنی یادوں کی مدد سے میرزا ادیب نے جس عہدِ رفتہ کی عکسی تصویر تیار کی ہے اس میں جو دنیا دکھائی دیتی ہے، اس کا مرکز گھرانہ ہے اور گھرانہ ہی کے حوالے سے زمانے کی شناخت ممکن ہوتی ہے۔ اس گھرانے کے خدوخال اس اعتبار سے اہم ہیں کہ یہ گھرانہ بے شمار گھرانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس گھرانے سے محلہ، مدرسے، اسکول اور معاشرے کی جو صورت دستیاب ہوتی ہے اس سے ایک ایسے زمانے کا علم ہوتا جو ساٹھ

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

برس قبل موجود تھا اور جس کے سائے تلے اس زمانے کی نسلیں گزری تھیں۔(۵)

ماں کا کردار گھرانے میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ ماحول سے کہیں زیادہ لازمی رشتہ ماں اور بچے کے مابین کارفرما ہوتا ہے۔ ماحول اور بچے کے درمیان ماں کا مقام انسانی زندگی کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ ماں اور اولاد کے مابین جذباتی تعلق اور اس کی بعض کیفیات بھی اس سوانح میں ان ہزاروں ماؤں کی عکاسی کرتی ہیں جو مشرقی معاشرے اور کلچر کا خاصہ ہے۔ میرزا ادیب نے اپنے خاندان کا تعارف جن چند افراد سے کرایا ہے ان میں اُن کی والدہ بھی شامل ہے۔ شاید یہی وہ واحد کردار ہے جس سے پڑھنے والے کو ہمدردی بھی ہوتی ہے۔ اس خودنوشت میں ماں کا رول کردار سازی کا ہے، مگر یہ کردار سازی اخلاقی اقدار سے پیدا ہوتی ہے۔ میرزا ادیب نے اپنی والدہ کا ذکر بڑی درد مندی سے کیا ہے ان کی والدہ ایک ایسے معاشرے کی پروردہ خاتون ہیں جو ایثار، خدمت، خود سپردگی اور دکھ جھیلنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ایک ایسے انسانی چلن کا ظاہر کرتی ہے جو زندگی بانٹنا جانتا ہے۔ وہ صبر وسکون کا پیکر اور جذبۂ قربانی سے سرشار ماں ہے جس کی زندگی میں دن رات کا کوئی خاص تصور نہ تھا۔ وہ ہر لحظہ مصروف رہتی تھیں۔ دوسری طرف گھر کا بنیادی کردار یعنی میرزا ادیب کے والد کا نقشہ بھی ایسا بیان کیا گیا ہے جو نہ تو غیر فطری معلوم ہوتا ہے، اور نہ ہی بعید از فہم۔ ان کے والد کے کام خاصے مختصر تھے۔ مثلاً انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے والد گھر میں والدہ سے لڑا کرتے تھے، یا پھر بچوں کی پٹائی کرتے تھے، نیز ان کے والد کے معمولات میں گھر کے باہر کئی جگہوں پر بیٹھنا اور شطرنج کھیلنا شامل تھا۔(۶) انھوں نے خاندان کے دوسرے افراد کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ اُن کی تین بہنیں بالکل جاہل تھیں، یعنی اس معاشرے میں عورتوں کی تعلیم اتنی عام نہیں ہوئی تھی، بلکہ بسا اوقات اولادِ نرینہ بھی علم کی روشنی سے محروم رکھی جاتی تھی۔ میرزا ادیب کا گھرانہ مشترکہ خاندانی نظام پر مبنی تھا۔ اُن کی دادی بھی ویسی خاتون تھیں جیسی بعض معاشروں میں توہّم پرست اور علم سے کوسوں دور خواتین ہوا کرتی ہیں۔ تعلیم کی اہمیت بھی اُن بزرگوں کی نظر میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ البتہ کم عمری میں ''کام'' پر لگ کر ہنرمند ہو جانا ان کی نظر میں محمود تھا۔ چناں چہ میرزا ادیب کے چھٹ پنے میں اُن کی دادی سے تعلیم کا پوچھا جاتا تو ان کا جواب یہی ہوتا کہ وہ کام کرے گا۔ اس ''کام'' پہ بھیجنے کا ہوکا بھی ایسا ہوتا تھا کہ بزرگوں کو یہی احساس کھائے جاتا تھا کہ ''رحمتے کی ماں کہتی ہے، دلاور بڑا ہو گیا، کام نہیں کرتا...!''(۷) جذبے کی یہ شدت بزرگوں کو بالآخر دلاور کو ایک بڑھئی کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس بڑھئی کے کارخانے میں کئی لڑکے کاریگر تھے۔ اور وہ ''استاذ'' بھی ویسا ہی استاد تھا، جیسا دیہی ماحول کے پروردہ تھوڑا بہت فن سے آشنا ہوا کرتے ہیں، کہ سکھاتے کم ہیں اور خدمت زیادہ لیتے ہیں۔ میرزا صاحب نے لکھا ہی:

اُس نے کام سکھانے سے پہلے حقہ تازہ کرنے، اگر جلانے اور چلم بھرنے کا فن سکھایا۔

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کہا کرتا تھا ''اولونڈے! حقہ تازہ نہیں کرو گے تو کام کیسے سیکھو گے؟''(۸)

میرزا ادیب نے تعلیمی کلچر کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے پرائمری اسکول کے ماسٹروں اور وہاں کی کلاسوں کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے ماسٹروں کی فرض شناسی، طلبہ سے اشیا منگوانے اور ڈنڈے کے استعمال کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ باتیں اس عہد کی دوسری خودنوشتوں میں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن میرزا ادیب نے اس مخصوص ماحول کے محرکات، منظر اور پس منظر پر جس چابک دستی سے روشنی ڈالی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنی ماسٹر جی کے گھر کا حال یوں بیان کی ہے:

> ہم سب معمولی گھروں میں رہتے تھے لیکن ماسٹر جی کا گھر دیکھ کر اپنے اپنے گھر بڑے شاندار لگے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ درمیان میں ایک چارپائی تھی۔ گندا بستر اور بہت ہی گندا تکیہ؛ ماسٹر جی اس چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف ایک بوڑھی عورت تھی جو زمین پر جھاڑو دے رہی تھی۔ یہ ماسٹر جی کی ماں تھی۔(۹)

اس اقتباس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مدرس حضرات کو اتنی قلیل تنخواہ ملتی تھی کہ اُن کی زندگی مفلسی اور عسرت کی نذر ہو جاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ لڑکوں سے فرمائش کر کے چیزیں منگواتے تھے اور بقول ڈاکٹر وہاج الدین علوی کے، شاید اس مفلسی اور کم مائیگی کا یہ نفسیاتی اثر تھا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔(۱۰)

مذکورہ بالا خودنوشت میں میرزا ادیب کے عہد کا لاہور جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ وہاں کے تہذیبی اور معاشرتی حالات کی بے حد دل چسپ انداز میں عکاسی کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن دنوں لاہور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت نہیں تھی، بلکہ محبت اور بھائی چارگی کی فضا تھی۔ دسہرہ اور دیوالی میں مسلمان شریک ہوتے تھے۔ ہندو محرم میں سبیل لگاتے تھے۔ ان دنوں لاہور میں کشتی اور پہلوانی کا بھی بڑا چرچا تھا۔ امام بخش پہلوان جو رستمِ زماں گاما پہلوان کا چھوٹا بھائی تھا، کے بارے میں بھی انھوں نے دل چسپ باتیں لکھی ہیں۔ الغرض ماضی کے شب و روز دہراتے ہوئے وہ کہیں بھی تنہا نظر نہیں آتے، بلکہ اپنی ذات سے زیادہ دوسروں کو ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''مٹی کا دیا'' میں جس ادبی و تہذیبی تغیرات کا اظہار ہوا ہے اس کے بارے میں مشفق خواجہ کی یہ رائے نہایت صائب ہے:

> مٹی کا دیا ایک فرد کی داستانِ حیات بھی ہے اور ایک عہد کی ثقافتی دستاویز بھی۔ ہماری تہذیب و معاشرت کے بہت سے ایسے پہلو اس میں نظر آجاتے ہیں جو اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ یہ آپ بیتی کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے اور میرزا ادیب نے اپنی ذات کے حوالے سے ایک دور کی مرقع سازی کی ہے۔(۱۱)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

''شہاب نامہ'' کا شمار اُردو کی مقبول خودنوشت میں ہوتا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں ابتدائی تعلیم کا بیان اور چند کرداروں مثلاً صادقہ بیگم اور چندرابتی کا بیان ہے۔ ''شہاب نامہ'' کا دوسرا حصہ مصنف کی ملازمتوں سے متعلق ہے۔ آئی سی ایس کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد وہ کئی بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھیں تین سربراہانِ مملکت کے پرنسپل سیکریٹری رہنے کا موقع ملا۔ انھوں نے اربابِ حکومت کی ذاتی زندگی اور پاکستان کے سیاسی کلچر کا ذکر جس تفصیل سے کیا ہے، وہ اس سوانح کو دوسری آپ بیتیوں سے منفرد بناتی ہے۔ خودنوشت میں جہاں ذاتی، جذباتی، روحانی واقعات کا بیان ملتا ہے، وہیں خاندانی، معاشرتی، سیاسی اور تاریخی واقعات کو بھی انھوں نے قلم بند کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک عہدساز نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار تھے۔ اُن کی خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' اپنے اسلوب کے لحاظ سے سوانح عمری، سیاحت نامہ اور سفرنامہ نگاری کا ایک حسین امتزاج ہے۔[۱۲] بنیادی طور پر یہ سوانح اُن قارئین کے لیے گائیڈ بک کا کام کرتی ہے جنھیں وزیر آغا کے فن کی عدم تفہیم کی شکایت ہے۔ چناں چہ بہت سے تصورات اور الجھنوں کو دور کرنے میں یہ آپ بیتی اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ وزیر آغا کا اندازِ تحریر بے حد شگفتہ ہے اور اسی شگفتہ اسلوب میں انھوں نے اپنے بچپن کے تعلیمی ماحول کو پیش کیا ہے:

> ایک لڑکا سامنے کھڑا ہو کر زور زور سے 'ایک دونی دونی، دو دونی چار' کا آوازہ لگاتا اور اس کے جواب میں اسکول کے سارے لڑکے اپنی پوری قوت سے پہاڑے کو دہراتے۔ ہماری آوازوں میں عجیب سا طنطنہ ہوتا تھا جس میں فریقِ مخالف کی آواز سے سبقت لے جانے کی کوشش کے ساتھ اسکول کی قید سے رہائی پانے کی مسرت بھی شامل ہوتی۔[۱۳]

وزیر آغا نے دیہی ماحول کو بھی بیان کیا ہے اور وہاں کے آداب و اطوار، رہن سہن، چال ڈھال، عادات و خصائل کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس سے آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا منظر آجاتا ہے:

> ہر کسان کے پاس ایک کچا کوٹھا تھا جس میں بکری، بیل، بھینس، کتا اور اس کا کنبہ رہائش پذیر تھے۔ بچوں کے آگے شب و روز ''تماشہ'' ہوتا رہتا تو وہ قبل از وقت ہی بلوغت کی خوشبو سونگھ لیتے اور پھر اخلاقیات کا منہ چڑانے لگتے۔[۱۴]

وزیر آغا کو دیہات اور شہر دونوں عزیز تر ہیں جس کی مثال اس آپ بیتی میں ملتی ہے۔ جب وہ دیہات کا ذکر کرتے ہیں تو شہری تہذیب و تمدن اور وہاں کے رہن سہن کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ آپ بیتی کا وہ باب جس کا عنوان ''سفر'' ہے، ایک ایسے صاحبِ دل انسان کا سفر ہے جسے دیہات کی کھلی فضا سے نکل کر شہر کی مشکل اور بے رحم دنیا میں ڈال دیا گیا ہو۔ گاؤں کی طرف واپسی نے اُن کو وہ بصیرت عطا کی جس کے ذریعے انھوں نے شہر اور دیہات کے عمرانی مسائل کو

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

علم کی طرح نہیں، احساس کی طرح اپنی ذات میں رچا بسا کر اسے خوب صورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔[۱۵] وزیر آغا نے قیامِ لاہور کے حوالے سے شہری زندگی کی جو دم گھٹنے والی تصویر کشی کی ہے وہ حقائق پر مبنی ہے۔ چوں کہ وہ دیہی کلچر کے پروردہ تھے اور انھیں شہری کلچر کی دشواریاں پسند نہیں رہی، اس لیے وہ شہر سے زیادہ گاؤں کے ماحول کو پسند کرتے ہیں۔ اس میں فطرت کے ساتھ ساتھ تہذیب سے وابستگی کا جابجا اظہار ہوا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے نجی زندگی کے ساتھ ساتھ اس عہد کے نمایاں واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔ ان واقعات میں تقسیمِ ہند اور ۱۹۶۵ء کی ہندوستان و پاکستان کی جنگ کا بطورِ خاص ذکر کیا ہے۔ اس عظیم واقعہ کو مصنف نے بڑے جذباتی انداز میں پیش کیا ہے جس سے وطنِ عزیز سے قلبی وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''چراغوں کا دھواں'' کے عنوان سے لکھی گئی انتظار حسین کی آپ بیتی میں ان کی ذات، خاندانی پس منظر، ان کا گردوپیش، ان کے عصری، سیاسی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کا ذکر ملتا ہے۔ ہجرت کے بعد جو کچھ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا، اسے اپنی آپ بیتی کے ذریعے پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے لاہور کے ادبی کلچر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں حسن عسکری، منٹو، ناصر کاظمی، سبطِ حسن، فیض، سجاد ظہیر وغیرہ کا بطور خاص تذکرہ ہوا ہے۔ لاہور کی تہذیبی، معاشرتی، ادبی، ثقافتی جھلکیاں اس خودنوشت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

قتیل شفائی کی خودنوشت ''گھنگھرو ٹوٹ گئے'' میں اُن کی اپنی ذات کی جھلک، زندگی کے حالات، اُن کی فنی مصروفیات کے علاوہ جو معاشرتی احوال ملتے ہیں اس سے معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے مذاق کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مصنف نے تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے انھیں واقعات کا تذکرہ کیا ہے جو اُن کی طبیعت پر اثر انداز ہوئے۔ اس کتاب سے جہاں ایک طرف فلمی دنیا کے کلچر پر روشنی ڈالی ہے، وہیں خانگی زندگی کا عکس بھی دیکھا جاسکتا ہے جس میں وہ ایک دردمند باپ اور عمر بھر کا ساتھ نبھانے والے مشرقی شوہر کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ قتیل شفائی نے نہ تو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور نہ ہی اپنی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ مبالغہ کیا ہے۔ اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ پاکستان کی جس نامور غزل گائیکہ سے اُن کا معاشقہ رہا، اس کی ناکامی کا سارا ملبہ ڈال کر اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ اُن کی رگوں میں ایشیائی خون دوڑ رہا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی خودنوشت ''گردِ راہ'' میں اپنے عہد کی معاشرت، قومی اقدار اور ہندو مسلم ثقافتی و مذہبی تہواروں کا دل چسپ بیان ملتا ہے۔ ایک عرصے تک باہمی میل جول کے نتیجے میں ہندو اور مسلمانوں کی ظاہری زندگی میں کوئی عملی فرق و امتیاز نہ رہا تھا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کی سماجی زندگی میں برابر شریک ہوگئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے تہواروں اور شادی بیاہ کی تقریبات میں خوش دلی سے حصہ لیتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی و

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ثقافتی تہواروں کا ذکر اچھوتے انداز میں کیا گیا ہے۔ ایک مشترکہ کلچر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہولی اور دیوالی ہندوؤں کے تہواروں کی طرح محرم اور ماہِ رمضان بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ رمضان کی خاص خاص تاریخوں کو رات گئے مسلمان نوجوان گیس لیمپ اٹھائے سحری کے گیت گاتے گشت لگاتے تھے اور ہر شام کو افطار کے وقت مسجدوں میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ محرم دکن کی روایت کے مطابق منایا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تعزیے اٹھاتے اور ان جلوسوں میں جوق در جوق شامل ہوتے تے جو ''سواری'' کے نام سے رات کو مشعلوں کے ہجوم میں رواں ہوتے تھے... غرض کہ دس دن ماتم کے ساتھ میلوں اور تماشوں کی ایسی رونق رہتی تھی جس کا تصور بھی اب ممکن نہیں۔ ہولی کی بات ہی نرالی تھی۔ جب ہندمرد و زن پچکاری سے رنگ پھینکتے، گلال ملتے گلی کوچوں میں نکل آتے تو سنجیدہ مسلمان گھروں میں چھپ جاتے، لیکن مجھ جیسے کم عمر بلاتکلف اس دل لگی میں شریک ہوجاتے اور جب شام سب لوگ نہا دھو کر چوراہے پر جمع ہوجاتے تو جہاں ہندو دکاندار مجرے اور دعوتِ عام کا انتظام کرتے تھے۔ بھنگ کے نشے کی مستی، ہولی کی نرت اور گیت کے لطف کو دو بالا کردیتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ عہدِ جدید کی مصنوعی دل چسپیوں کی بہ نسبت وہ پرانے مشاغل شاید کہیں زیادہ معصوم اور دلربا تھے۔(۱۶)

یہ کتاب ان کی زندگی کا مرقع ہے ہی نیز اس دور اور معاشرت کا بھی آئینہ ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور زندگی کا سفر طے کیا۔

ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' میں اس دور کی تہذیب وتمدن، طرزِ فکر اور طرزِ معاشرت موجود ہے جس میں مصنفہ نے آنکھ کھولی۔ جہاں عورت ذات پر مرد کا غلبہ ہے۔ وہ ان روایات میں جکڑی ہوئی ہے جو خود مردوں کی وضع کردہ ہے۔ مصنفہ نے اپنی ابتدائی زندگی اور اس دور میں پیش آنے والے واقعات و حادثات پر تفصیل سے لکھا ہے اور ایک شاعر کی طرح محسوس کر کے لکھا ہے۔ انھوں نے اس وقت کے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ ماحول کا نقشہ بہت خوب صورتی سے کھینچا ہے۔ اس پورے ماحول میں عورت مرد کی جاگیر اور غلام تھی۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

> مرد تھے جن کی جنبشِ ابرو پر زندگی بھر کی خوشیوں یا محرومیوں کے فیصلے ہوتے تھے اور بی بیاں تھیں جو ان فیصلوں کو دین ایمان کے احکام کا درجہ دیتی تھیں۔(۱۷)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آگے لکھتی ہیں:

> مرد کے پندارِ برتری نے عورت کو علم و آگہی کے ورثے کے قابل ہی نہیں سمجھا تھا اور مدتوں عورت احساسِ محرومی سے بھی محروم رہی۔ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ ٹونک والا پھاٹک کے اندر زمرد کا گلوبند ادراکِ حیات سے زیادہ قیمتی تھا؛ یوں بھی جاگیرداری نظام میں یہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زیرِ نگیں مخلوق کو کس حد تک شرف دینا چاہتا ہے۔ اور مرد کو عورت کے ذہن یا اس کے علم کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہ تھی۔(۱۸)

اس میں جابجا ایسے واقعات نظر آجاتے ہیں جو معاشرے کے بعض غیر مستحسن رویوں کو واضح کرتے ہیں۔ ایک ایسا کلچر جس میں مرد عورت پر غلبہ بھی چاہتا ہے اور عورت کے معاشرے میں کمتر مقام کے باوصف ناجائز فائدہ بھی اٹھانا چاہتا ہے۔ ایک بے بس اور مجبور خاتون کے بارے میں لکھے گئے واقعات پاکستانی کلچر کے تناظر میں مرد اور عورت کے مقام کو واضح کرتے ہیں:

> شوہر جو اکھیلتا تھا۔ (یہ میں نے بعد میں سنا تھا) ظاہر ہے بیوی کی جمع پونجی کتنے دن اس شوق کا ساتھ دے سکتی تھی۔ پیسے ختم ہو جاتے مزید جوا کھیلنے کی استطاعت نہ رہتی تو وہ بیوی کو مجبور کرتا کہ حویلی میں جا کر کام شروع کر دے۔ ادھر وہ تھی کہ ہر حال میں رُوکھی سُوکھی کھا کر بھی اپنے شوہر اور بچیوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔(۱۹)

> لڑکیوں کے لیے اسکول کالج کے تمام دروازے ابھی تک بند تھے۔ خواتین قرآن مجید کے بعد اُردو پڑھنا لکھنا سیکھ لیتی تھیں اور گویا ان کے لیے حصولِ تعلیم کے تمام مراحل طے ہو جاتے تھے۔ گھر کے مرد تعلیم یافتہ بھی تھے۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھتے بھی تھے، لیکن جو خاندانی خود ساختہ بے لچک اصول تھے ان کی پاس داری بہرحال فرض تھے۔(۲۰)

یہ واقعہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ یہاں کی عورت باحیا اور برداشت کے عنصر سے بھرپور ہے۔ ایک جبر کا رویہ ہے جس کے سامنے وہ بے بس اور لاچار ہے اور اس کے اختیار میں کچھ نہیں۔ تاہم وہ اپنے بُرے حالات میں صبر کا دامن نہیں چھوڑتی۔ ایسا ہی ایک اور واقعہ اس کلچر سے تعلق رکھنے والی خواتین کے صبر کی نشاندہی کرتا ہے:

> یہ وہ خاتون تھی جس نے غربت اور افلاس کے زمانے میں اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنے گھر کے اندر مقفل رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اور اب ایک پشیماں، بے آسرا اور اجڑی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ہوئی جوان عورت کو پناہ دینے کے لیے محلے والوں کے سامنے اپنی ذاتی ساکھ اور عزت کو ثانوی حیثیت دے رہی تھی۔ جان پہچان والوں میں برسوں کی کمائی ہوئی اپنی آبرو کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اور اس پر کوئی پشیمانی بھی نہیں تھی۔(۲۱)

مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کی آپ بیتی ''زرگزشت'' ۱۹۷۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔ ''زرگزشت میں ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک کے حالات و واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف کے حالاتِ زندگی کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہے، اُن کی شخصیت نہ تو پوری طرح دکھائی دیتی ہے، نہ ہی پوری طرح غائب ہے۔ اس میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے دوستوں اور دوسرے لوگوں کا ذکر ہوا ہے۔ یوسفی نے بینک ملازمت کے دوران ہونے والے تجربات اور مشاہدات کو مزاحیہ اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

ان واقعات، مشاہدات اور تاثرات کا تعلق میرے بینکنگ کیریر کے ان ابتدائی چھ سات برسوں سے ہے جب اس پیشے کا بھرم قائم تھا۔ البتہ انشورنس ایجنٹوں سے لوگ چھپتے پھرتے تھے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ انشورنس ایجنٹ تک بینکروں سے منہ چھپانے لگے۔(۲۲)

اس کتاب میں ہمیں جہاں مزاح کے اچھے نمونے ملتے ہیں، وہیں دوسری طرف سنجیدہ مناظر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کر کے یوسفی جب پاکستان پہنچے ہیں وہ اس کا منظر کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

کراچی میں براہِ کھوکھراپار وارد ہوئے ہمیں بیس گھنٹے ہوئے تھے۔ وہ صبح نہیں بھولے گی جب ریلوے لائن کے کنارے ایک چھوٹی سی سفید چمکتی تختی پر پہلے پہل ''پاکستان'' لکھا نظر آیا تو اسے ہاتھ سے چھو چھو کر دیکھا تھا۔ پھر مٹی اٹھا کر دیکھی، السلام علیکم کہتے ہوئے سندھی ساربان دیکھے، ہندوستان کے نوٹ پر پہلی دفعہ حکومتِ پاکستان چھپا ہوا دیکھا اور پھر ریگزارِ راجستھان میں پرکھوں کی قبریں، وہ بولی جو ماں کے دودھ کے ساتھ وجود میں رچی بسی تھی اور اپنے پیاروں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے خیر گئی امروز میں دھندلاتے چلے گئے۔(۲۳)

اس سوانح میں اس قسم کے اقتباسات کے ذریعے ہم مصنف کے جذبات و احساسات کو صاف پر دیکھ سکتے ہیں۔

ناول نگار رحیم گل کی خودنوشت ''داستاں چھوڑ آئے'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ آپ بیتی کے مطالعے سے مصنف کی پیدائش اور بچپن میں مختلف قسم کے جانور اور پرندے پالنے کے شوق کا پتا چلتا ہے۔ ابتدائی ابواب میں اپنے خاندانی پس منظر کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی فوجی زندگی کی روداد بیان کرتے ہوئے وہاں کے ماحول کے طور طریقے اور

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

دوستوں اور افسران کے رویوں کا ذکر کیا ہے۔

''یادِ عمرِ رفتہ'' عبادت بریلوی کی داستانِ حیات ہے۔خودنوشت کے ابتدائی ابواب میں خاندانی پس منظر بیان کرتے ہوئے مخصوص کلچر میں ڈھلے ہوئے اپنے بزرگوں کے اوصاف، عادات و اطوار کی خوب صورت مرقع کشی کی گئی ہے۔ان بزرگوں میں سب سے زیادہ ذکر اپنی دادی اماں کا کیا ہے۔انھوں نے ان کا خاکہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ اُن کے مزاج، سیرت و کردار اور عادات و خصائل ظاہر ہو کر قاری کی آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں:

> ہماری دادی اماں صورت و سیرت دونوں کے اعتبار سے ایک شاہکار تھیں۔اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے ہاتھ سے بنایا تھا۔گول چہرے، میانہ قد، سفید چمپئی رنگ، چاندی کی طرح سفید بال، چہرے پر جھریاں لیکن آواز میں گھن گرج کی کیفیت، سخت مزاج، بے باک، نڈر، ایماندار، سچ کی پرستار، ملنسار، مہمان نواز، ہمدرد، دوستوں کی دوست، دشمنوں کی دشمن، سونے کا نوالہ کھلانے والی، شفقت اور محبت کا ایک امنڈتا ہوا سمندر، قوتِ ارادی کا پیکر اور فکر و عمل کے اعتبار سے ایک طوفان۔ یہ تھیں ہماری دادی اماں۔(۲۴)

ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے مذہبی رسومات، خاص طور پر عید، شبِ برات، گیارہویں شریف اور محرم کے تعزیہ داری کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔اگلے باب مین ابتدائی تعلیم، کھیل کود، سیر و تفریح اور میلوں ٹھیلوں کا بیان ہے۔اس کے علاوہ اپنے اساتذہ کا ذکرِ خیر اسی ادب و احترام کے ساتھ کیا ہے جو ہمارے مشرقی کلچر کا خاصہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی سرگزشت ''نشانِ جگر سوختہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آئی جو بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔فلیش بیک کے تحت انھوں نے اپنی زندگی کی ابتدائی یادوں کو بیان کرتے ابتدائی تعلیم، اسکول اور دوستوں کا تذکرہ کیا ہے۔قیامِ پاکستان کے بعد پیش آنے والے حالات کا تجزیہ اور نامحمود معاشرتی رویوں کا ذکر انھوں نے بڑے دکھی دل کے ساتھ کیا ہے۔اس وقت ان کا سیاسی و سماجی شعور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

> کرپشن، رشوت، عدم عدل کی وجہ سے آج پاکستان کینسر کے مرض سے مشابہ نظر آتا ہے۔تو یہی وہ ٹیڑھی اینٹیں ہیں جس پر اس ملک کی بنیاد استوار کی گئی۔شہیدوں کے خون کے ساتھ بلکہ جس ارزاں نرخ پر خونِ شہدا کی سوداگری ہوئی وہ ہماری تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ہندوؤں کے مکانات کے تالے توڑ کر ان پر جو پڑوسی قابض ہوئے، اُن ہی کے پوتے قبضہ گروپ کے بانی تھے۔جعلی الاٹمنٹوں، بوگس کلیمز، ''دھنیے کے کھیت''، ''پودینے کے باغات'' اور مولیوں ن کی فصلوں والوں نے نئے ملک میں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

جھوٹ، دغا اور فریب کی ایسی فصل بوئی جس نے گلشن جیسے وطن کو خارستان میں تبدیل کر دیا۔ سب سے پہلے بحالیات کے محکمہ میں رشوت اور حق تلفی کا چلن ہوا اور ان سب پر مستزاد وہ طالع آزما سیاستدان جنھوں نے نوزائیدہ ملک کو حلوائی کی دکان جانا۔(۲۵)

سوانح عمریوں میں ''بری عورت کی کتھا'' کو اہمیت حاصل ہے۔ یہ کشور ناہید کی آپ بیتی ہے۔ اس آپ بیتی میں پاکستانی معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے ظلم اور استحصال کے لیے مرد ذات کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ معاشرے میں مرد کے غلبہ کے سبب یہاں کی متوسط طبقے کی عورتوں کو جن مشکل حالات اور ظلم و جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کی عکاسی اس آپ بیتی میں ملتی ہے۔ اس طرح یہ خوش نوشت صرف کشور ناہید کی ہی نہیں بلکہ پوری عورت کی ذات کی خودنوشت ہے۔ اس کے علاوہ مذہب جسے بہت سے معاملات میں مرکزیت حاصل ہے، پر بھر مصنفہ نے تیکھے وار کیے ہیں۔ خاندانی حالات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ماں باپ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اپنی والدہ کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی چوتھی بیوی تھیں اور عام عورتوں کی طرح قرآن شریف اور بہشتی زیور تک ہی اُن کی تعلیم محدود تھی۔ فراہم کی گئی معلومات سے اُن کی والدہ کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک صابر و شاکر عورت کی ہے، جو بچوں سے نہ صرف محبت کرتی ہے، بلکہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں فعال کردار بھی ادا کرتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اپنے والد کو ایک کم پڑھا لکھا اور بات بات میں غصہ ور شخص کے طور پر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ مصنفہ نے مردانہ رویوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور مردانہ معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کو بیان کیا ہے جس کا خود مصنفہ کو سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد مصنفہ نے اپنی مرضی سے شادی کر لی (جس کا کم سے کم نتیجہ ہمارے معاشرے میں والدین کا سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لینا ہے اور یہی ہوا) پسند کی شادی کی وجہ سے گھر والوں نے ان سے قطعِ تعلق کر لیا اور گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ آپ بیتی میں ماں باپ، بھائی بہن، سسرال کے ذکر کے علاوہ اپنے شوہر کی عیاشیوں اور عیاریوں سے بھی واقف کرایا گیا ہے۔ اس آپ بیتی کے مطالعے سے ایک بے باک عورت کے خیالات کی عکاسی ہوتی ہے جو مردانہ سماج کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہے۔ معاشرے میں مرد ذات کا عورتوں کی حق تلفی اور اُن پر ظلم و جبر کی تصویر پیش کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

اندھی صفیہ بی بی نے جب سوال کیا ''میرے ساتھ زیادتی ہوئی، میں حاملہ ہوئی، میں زیادتی کرنے والے کا نام نہیں جانتی۔'' شرعی عدالت نے اس کے منہ پہ تھپڑ مارا۔ اس کے لیے ۲۰ کوڑوں اور ۱۶ سال قید کی سزا تجویز کی۔ وہ بھی سزا سن کر سرابور ہو گئی تھی۔ زمین اعتبار نہیں کرتی۔ آسمان یقین نہیں کرتا مگر پاکستان میں ہوا۔ گزشتہ ۱۴ برس میں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۱۹۷۹ء سے اب ۱۹۹۳ء تک، کہ شوہروں نے بیویوں کو زنا کے جرم میں جیل بھجوا دیا کہ وہ سکون سے دوسری شادی کر سکیں۔ بھائیوں نے بہنوں پہ زنا کا الزام لگایا اور اُن کا حقِ وراثت ہڑپ کر لینے میں مردانگی محسوس کی۔ بیٹیوں کو باپوں نے زنا کا مجرم گردانا کہ وہ اپنی مرضی کی شادی نہ کر سکیں اور باپ وہ زرِفروخت حاصل کر سکیں جس کے عوض اُن کی زندگی میں آسودگی آ سکے۔(۲۶)

سابقہ مشرقی پاکستان میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کی مصنفہ عینی شاہد ہیں۔ جس طرح یہاں کی عورتیں درندگی کا شکار ہوئیں، وہ صورتِ حال کسی بھی باضمیر انسان کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے:

بوڑھی گنگا کے کنارے کیمپ بھرا تھا۔ عورتیں ہی عورتوں، کیا میں انھیں عورتیں کہوں۔ مشکل سے تیرہ سے پندرہ سال کی پتلی پتلی لڑکیاں جن کی ابھی چھاتیاں بھی سانس لینے نہیں پائی تھیں، مگر ان کے پیٹ چھٹے یا ساتویں مہینے کی گواہی دے رہے تھے، ان کے گھر والے کہاں تھے، وہ تو رات کے اندھیرے میں سازشی اور غدار کہہ کر مار دیے گئے تھے... وہ بے اماں، بے جگہ، بوڑھی گنگا کی گود میں، سوکھے ہونٹ اور سوکھی آنکھیں لیے سرنگوں بیٹھی تھیں۔(۲۷)

عورتوں پر ہونے والے مظالم کی داستان کو انھوں نے سچائی اور ایمانداری کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ صرف ہمارے معاشرے کی عورت کے لیے ہی نہیں، بلکہ انھوں نے بوسنیا، صومالیہ، گھانا، کشمیر اور فلسطین کی مظلوم عورتوں کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ اور ایسے مردوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو نہ تو بیوی کی مادی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں، نہ ہی جسمانی ضرورتوں کا احساس۔ اس ضمن میں کشور ناہید کا رویہ تلخ اور انتہا پسندانہ نظر آتا ہے، تاہم اس کے باوجود جو حقائق پیش کیے گئے ہیں اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔

زیرِ نظر مقالے میں ہم نے اردو سوانح کو کلچر کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ سوانح میں محض تمدنی زندگی کی آئینہ داری فی نفسہ مقصود نہیں ہوتی، تاہم کسی فرد کی سیرت اور ذہنی ارتقا بغیر اس دور کی تمدنی زندگی کے سمجھا نہیں جا سکتا۔(۲۸) بیان کردہ حوالہ جات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سوانح نگاروں نے اُس وقت کے حالات کو اس طرح قلم بند کیا ہے کہ وہ اُس وقت کی کلچر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان سوانح میں اپنے دور کی تاریخی، سیاسی، معاشی، معاشرتی حالات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے یہ سوانح اپنے عہد کی ایک ایسی تخلیقی دستاویز ہیں جن میں تاریخ، ادب اور کلچر ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں۔ یہ سوانح ایک فرد کی داستانِ حیات بھی ہیں اور ایک عہد کی ثقافتی دستاویز بھی۔ ہماری

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تہذیب و معاشرت کے بہت سے ایسے پہلو ان میں نظر آتے ہیں جو اب ہمارے درمیان سے اب مٹتے جاتے ہیں۔ سوانح نگاروں نے اپنی ذات کے حوالے سے پورے ایک دور کی مرقع نگاری کی ہے۔ سوانح عمریوں کا مطالعہ جہاں مختلف ادوار کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، وہیں اگر بہ نگاہِ غور دیکھا جائے تو مختلف افراد کے حالاتِ زندگی، افتادِ مزاج کے ساتھ ساتھ ثقافتی ماحول سے بھی آگاہی بخشتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سوانح کے ساتھ اگر معاشرتی اور تہذیبی ماحول پیش نہ کیا جائے تو سوانح نگار کے مزاج و زندگی اور معیارِ فکر کی ٹھیک ٹھیک پہچان ممکن نہیں رہتی۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ''پاکستانی کلچر''، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۲

۲۔ ایضاً

۳۔ محمد فاروق، ''انسانی تہذیب اور خلافت کا نظام''، (لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۹ء)، ص ۳۱

۴۔ عبدالمجید سالک، ''سرگزشت''، (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۵۳

۵۔ جیلانی کامران، ''مٹی کا دیا'' (مضمون) مشمولہ ''میرزا ادیب: شخصیت اور فن''، مرتبہ: رشید امجد، (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء)، ص ۴۰۳

۶۔ میرزا ادیب، ''مٹی کا دیا''، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۵

۷۔ ایضاً، ص ۲۹

۸۔ ایضاً، ص ۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۱۰۔ وہاج الدین علوی، ''مٹی کا دیا'' (مضمون) مشمولہ ''میرزا ادیب: شخصیت اور فن''، محولۂ بالا، ص ۲۱۴

۱۱۔ مشفق خواجہ، فلیپ، ''مٹی کا دیا''، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء

۱۲۔ حیدر قریشی، ''ڈاکٹر وزیر آغا: عہد ساز شخصیت''، (خان پور: نایاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۳۵

۱۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ''شام کی منڈیر سے''، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۲۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۹۳

۱۵۔ محمد نوشاد عالم، ''اُردو خودنوشت سوانحِ حیات: آزادی کے بعد''، (دہلی: عریشہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۰۱

۱۶۔ اختر حسین رائے پوری، ''گردِ راہ''، (کراچی: مکتبۂ افکار، ۱۹۸۴ء)، ص ۴۳۔۴۴

۱۷۔ ادا جعفری، ''جو رہی سو بے خبری رہی''، (نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۶ء)، ص ۶۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۸

۱۹۔ ادا جعفری، ''جو رہی سو بے خبر رہی''، (کراچی: زم زم پریس، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۲۲۔ مشتاق احمد یوسفی، ''زرگزشت''، (کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۱

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۲۳۔ ایضاً،ص ۲۳
۲۴۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ''یادِ عہدِ رفتہ''، (لاہور: ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۸۸ء)،ص ۹
۲۵۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''نشانِ جگر سوختہ''، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)،ص ۲۴
۲۶۔ کشور ناہید، ''بری عورت کی کتھا''، (نئی دہلی: ادیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)،ص ۵۳
۲۷۔ ایضاً،ص ۲۷
۲۸۔ ڈاکٹر عبدالقیوم، ''حالی کی نثر نگاری'' (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۶۴ء)،ص ۱۰۹

مآخذ

۱۔ آغا، وزیر، ڈاکٹر، ''شام کی منڈیر سے''، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء
۲۔ اختر، سلیم، ڈاکٹر، ''نشانِ جگر سوختہ''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
۳۔ ادیب، میرزا، ''مٹی کا دیا''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء
۴۔ بریلوی، عبادت، ڈاکٹر، ''یادِ عہدِ رفتہ''، لاہور: ادارۂ ادب وتنقید، ۱۹۸۸ء
۵۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، ''پاکستانی کلچر''، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۸ء
۶۔ جعفری، ادا، ''جو رہی سو بے خبری رہی''، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۶ء
۷۔ _____، _____، کراچی: زم زم پریس، ۲۰۱۳ء
۸۔ خواجہ، مشفق، فلیپ، ''مٹی کا دیا''، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء
۹۔ رائے پوری، اختر حسین، ''گردِ راہ''، کراچی: مکتبۂ افکار، ۱۹۸۴ء
۱۰۔ سالک، عبدالمجید، ''سرگزشت''، لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۱۹۹۳ء
۱۱۔ عالم، محمد نوشاد، ''اُردو خودنوشت سوانحِ حیات: آزادی کے بعد''، دہلی: عریشہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء
۱۲۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر، ''حالی کی نثر نگاری''، لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۶۴ء
۱۳۔ علوی، وہاج الدین، ''مٹی کا دیا'' (مضمون) مشمولہ ''میرزا ادیب: شخصیت اور فن''، مرتبہ: رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء
۱۴۔ فاروق، محمد، ''انسانی تہذیب اور خلافت کا نظام''، لاہور: دارالشعور، ۲۰۰۹ء
۱۵۔ قریشی، حیدر، ''ڈاکٹر وزیر آغا: عہد ساز شخصیت''، خان پور: نایاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۱۶۔ کامران، جیلانی، ''مٹی کا دیا'' (مضمون) مشمولہ ''میرزا ادیب: شخصیت اور فن''، مرتبہ: رشید امجد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء
۱۷۔ ناہید، کشور، ''بری عورت کی کتھا''، نئی دہلی: ادیب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۱۸۔ یوسفی، مشتاق احمد، ''زرگزشت''، کراچی: مکتبۂ دانیال، ۱۹۷۶ء